R. No. 2186031 — Regd. No. A. 922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۰ - شمارہ ۲۶	ایڈیٹر - آل احمد سرور	علی گڑھ - ۸ جولائی سنہ ۱۹۶۱ء

(اختر حسن (حیدرآباد)

"قطب مشتری" اور "سب رس" کے مصنف مُلّا وجہی کا فارسی دیوان

(شاعر کے بارے میں بعض نئی معلومات)

آج سے تقریباً ساڑھے چار سو برس پہلے گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کے پانچویں فرمانروا سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں قدیم اُردو کے جن شاعروں اور نثر نگاروں نے اُردو ادب کی تاریخ کا سنگ بنیاد رکھا ان میں معانی اور وجہی کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے۔ بادشاہ وقت محمد قلی قطب شاہ معانی میدان شاعری کا شہسوار تھا، لیکن وجہی کو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ قدیم اُردو نثر میں وجہی کی دو تصانیف "سب رس" اور "تاج الحقائق" اور نظم میں اس کی مثنوی "قطب مشتری" دستیاب ہو چکی ہیں۔ عصر حاضر کے محققین میں سب سے پہلے مولوی عبدالحق صاحب نے وجہی کو دریافت کیا اور اپنے محققانہ اور عالمانہ مقدموں کے ساتھ "سب رس" اور "قطب مشتری" کو شائع کیا لیکن مولوی صاحب موصوف کی تمام سعی و کاوش کے باوجود وجہی کے حالات زندگی پردۂ تاریکی ہی میں رہا ہے۔ قطب شاہی دور کی تواریخ اور تذکرے بھی وجہی کے ذکر سے خالی ہیں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وجہی نے طویل عمر پائی، قطب شاہی خاندان کے چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں اس کا بچپن گزرا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دورِ حکومت میں وہ دکھنی اردو کے ایک شیوہ بیان شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوا اور قطب شاہی دربار کا ملک الشعراء بن گیا۔ محمد قلی کے انتقال سے دو سال قبل ۱۰۱۸ھ میں اس نے اپنی مشہور مثنوی "قطب مشتری" لکھی اور پھر جب محمد قلی قطب شاہ کے انتقال (۱۰۲۰ھ) کے بعد اُس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد تخت نشین ہوا تو وجہی نے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ سلطان محمد نے پندرہ سال تک حکومت کی۔ اس پورے دوران میں وجہی زمانہ کی نگاہوں [illegible] رہا لیکن سلطان محمد کے انتقال کے بعد ۱۰۳۵ھ میں عبداللہ قطب [illegible] نے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تو ایک مرتبہ پھر محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ لوٹ آیا اور وجہی بھی اپنے گوشۂ عزلت سے باہر نکلا، محمد قلی کی طرح سلطان عبداللہ بھی ایک رنگین مزاج اور ادب دوست بادشاہ تھا، اس کے زمانے میں دکھنی اُردو کے ایک اور نوخیز شاعر غواصی نے زبردست شہرت حاصل کی اور سلطنت گولکنڈہ کا ملک الشعراء بن گیا۔ سلطان عبداللہ نے وجہی کو بھی اپنے دربار میں باریاب کیا اور اپنے بذل و کرم سے نوازا۔ چنانچہ اسی عہد میں وجہی نے اپنی مثنوی "قطب مشتری" کی تصنیف کے تقریباً ۲۸ سال بعد یعنی ۱۰۴۵ھ میں "سب رس" لکھی جو قدیم اُردو کی ادبی نثر کا پہلا نمونہ اور وجہی کا ایک نادر ادبی کارنامہ ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور کے تمام شاعر وجہی کو سرآمد سخنوران مانتے ہیں اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے زمانۂ گوشہ نشینی میں اور پھر عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں دکھنی نظم و نثر کے اس پختہ کار ادیب و شاعر نے بہت کچھ لکھا ہو لیکن "قطب مشتری"، "تاج الحقائق" اور "سب رس" کے علاوہ اس کی کسی اور ادبی تخلیق کا اب تک کوئی پتہ نہیں چلا ہے۔ البتہ حال ہی میں مجھے اس کا فارسی دیوان ملا ہے۔ وجہی کے فارسی دیوان کا یہ نادر و نایاب قلمی نسخہ سالار جنگ لائبریری (حیدرآباد) میں محفوظ ہے۔ اس دیوان کے مطالعہ سے وجہی کی زندگی کے بعض نامعلوم گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف قدیم اُردو ہی کا شاعر اور انشا پرداز نہیں تھا بلکہ فارسی زبان پر بھی اسے پوری دستگاہ تھی اور اپنے زمانے میں فارسی کے ایک نغز گو شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور و متعارف تھا۔

قطب شاہی دور کے فارسی ادب پر اپنی کتاب کی تیاری کے

سلسلے میں مجھے وجہی کے فارسی کلام کی تلاش تھی۔ دل کہتا تھا کہ اس زمانے کے عام رواج کے مطابق وجہی نے ضرور فارسی میں بھی شاعری کی ہوگی، پھر بعض قطب شاہی تواریخ میں وجہی کی دو ایک فارسی تاریخوں پر نظر پڑی، اور ڈاکٹر زور نے بھی ایک مرتبہ دوران گفتگو میں فرمایا کہ کوئی ۲۰ سال قبل قاسم علی بیگ صاحب کے خانگی کتب خانے میں وجہی کا فارسی دیوان ان کی نظر سے گزر چکا ہے، اتفاق سے ایک روز جناب قدرت رحیم صاحب سے اس بات کا ذکر آیا، صاحب موصوف آج کل سالار جنگ لائبریری میں مخطوطات کی فہرستیں مدوّن کر رہے ہیں، مشرقی علوم پر ان کی نظر بہت گہری ہے اور اسٹیٹ لائبریری اور سالار جنگ لائبریری کے سارے نادر مخطوطات کی تفصیلات اُن کے سینہ میں محفوظ ہیں۔ میں اُن کا بے انتہا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری رہنمائی فرمائی اور یہ بتایا کہ کتب خانہ سالار جنگ میں "دیوان وجیہہ" کے عنوان سے فارسی کا ایک قلمی دیوان موجود ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اسی وجہی کا دیوان ہو جس کی تلاش میں آپ سرگرداں ہیں۔ اور پھر میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے "دیوان وجیہہ" کا مطالعہ کیا اور مجھے یہ پتہ چلا کہ واقعی یہ اسی وجہی کا فارسی دیوان ہے جس نے "قطب مشتری" اور "سب رس" لکھ کر اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اپنے نام کو امر بنا دیا ہے۔ وجہی کے فارسی کلام سے بعض ایسی داخلی شہادتیں فراہم ہوتی ہیں جن سے وجہی کی زندگی کے کچھ نامعلوم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

اب تک یہ نہیں معلوم تھا کہ قطب شاہی دور کے اس نامور شاعر کا نام کیا تھا، وہ کہاں کا رہنے والا تھا اور اس کے آبا و اجداد کس سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ وجہی کے فارسی دیوان کے بعض اشعار میں ایسے اشارے مل جاتے ہیں جن سے ان باتوں کا پتہ چلتا ہے اس لحاظ سے وجہی کے فارسی دیوان کے اس قلمی نسخے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ امید ہے کہ قدیم دکھنی ادب پر کام کرنے والے ارباب تحقیق کے لیے یہ انکشافات کسی طرح ایک ادبی بشارت سے کم نہ ہوں گے۔

"دیوان وجیہہ" کا زیر نظر قلمی نسخہ ۲۵۲ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ گیارہ سطری ہے۔ اس اعتبار سے وجہی کے فارسی کلام کا یہ نایاب ذخیرہ کم و بیش تین ہزار نو سو ابیات پر حاوی ہے، افسوس ہے کہ "دیوان وجیہہ" کا یہ بیش قیمت نسخہ ناقص الطرفین ہے، ابتدا کے تو غالباً دو ایک ورق ہی غائب ہیں لیکن ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ آخر کے متعدد اوراق تلف ہو گئے ہیں۔ دیوان کا آغاز غزلوں سے ہوتا ہے جو حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہیں، صفحہ ۲۱۰ پر غزلیں ختم ہو جاتی ہیں اس کے بعد آخری ۴۲ صفحات علی الترتیب ۵۲ رباعیوں، چند قطعات و معمیات اور ایک نا تمام قصیدے پر مشتمل ہیں۔ دیوان کے ابتدائی اور آخری چند اوراق کے بعض حصے پانی اور نمی کے دھبوں سے متاثر ہو گئے ہیں جس کے باعث بعض اشعار بالکل نہیں پڑھے جاتے، آخری پانچ چھ صفحات کو کرم کتابی نے بھی کچھ نقصان پہنچایا ہے۔ دیوان کے صفحۂ آغاز پر پنسل سے لکھی ہوئی یہ عبارت ملتی ہے:-

"دیوان وجیہہ فارسی صہ از سید ابراہیم یداللّہی تاجر کتب قدیم مسکونہ محلہ چنچل گوڑہ، حیدرآباد دکن۔"

ورق ۹۹ الف کی پیشانی پر یہ عبارت مرقوم ہے:-

"مالک این کتاب حاجی محمد بدرالدین عرف بدھن صاحب ساکن برہانپور بسبب ضرورت در شہر حیدرآباد آمدہ بود۔ این کتاب را در چوک بہ مبلغ سہ روپیہ خرید نمودہ است اگر کسے بر آں بخود نماید ... شود۔"

اور ورق ۱۰۱ب کے حاشیہ پر یہ الفاظ درج ہیں:-

"حکیم مرزا قاسم علی بیگ سنہ ۱۳۱۱ ہجری"

ڈاکٹر زور نے بیان کیا تھا کہ انھوں نے کوئی ۲۰ سال قبل قاسم علی بیگ کے ذاتی کتب خانہ میں "دیوان وجیہہ" دیکھا تھا۔ غالباً یہ وہی نسخہ ہے جسے قاسم علی بیگ نے محمد بدرالدین عرف بدھن صاحب سے یا کسی اور صاحب سے خریدا ہوگا۔ پھر وہ ان کے خانگی کتب خانے سے "ابراہیم یداللّہی تاجر کتب قدیمہ" کے پاس پہنچ گیا اور قدیم کتابوں کے اس تاجر نے اسے نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس طرح دیوان وجہی کا یہ نادر مخطوطہ سالار جنگ لائبریری میں محفوظ ہو گیا، کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں ہے لیکن کاغذ قدیم ہے اور کتابت کا انداز بھی دسویں صدی ہجری کا ہے۔ کہیں کہیں حاشیوں پر بھی کچھ اشعار لکھے گئے ہیں، اور متن کے اشعار میں بعض مقامات پر بعض الفاظ قلمزد کر کے ان کی جگہ دوسرے الفاظ درج کیے گئے ہیں۔ کاتب صاحب کم سواد معلوم ہوتے ہیں، ہجے کی متعدد غلطیاں پائی جاتی ہیں، خط نستعلیق ہے لیکن معمولی۔ دیوان کا آغاز اس مطلع سے ہوتا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اوپر کے چند صفحات ضائع ہو گئے ہیں ؎

جا شدہ است درین بزم وجیہی کہ ز رشک
حسرت بدہان خاک کند ظلمت جسم را

میں نے الف سے ی تک پورے دیوان کا بہ غائر مطالعہ کیا صرف ایک شعر ایسا ملا جس سے وجہی کا نام معلوم ہوتا ہے، ردیف ت کی ایک غزل (ورق ۲۶ ب) کے مقطع میں شاعر بتاتا ہے کہ ؎

نام اسد اللہ وجیہہ است تخلص
آرائش دکانچہ بازار کلام است

یہ ایک ایسی واضح داخلی شہادت ہے جس کی بنا پر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم دکھنی اُردو کے مشہور شاعر و نثر نگار وجہی کا نام وجیہ الدین یا وجیہہ الدین نہیں تھا جیسا کہ اب تک اہل تحقیق قیاس کرتے چلے آئے ہیں بلکہ اس کا نام اسد اللہ تھا۔ اس نام سے اس کے مذہبی عقیدہ و مسلک کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ اسد اللہ نے اپنے فارسی کلام میں وجیہہ کے علاوہ وجہی اور وجیہی کے الفاظ بھی تخلص کے طور پر استعمال کیے ہیں، ملاحظہ ہو:-

سخن بافتہ در رخ چند را عزت چہ خواہد بود
وجہی شاعری بگذار و فکر کار دیگر کن!

(باقی ص ۴ پر)

ادار یہ

لو دکن سے پھر بہار جانفزا آئی ہے آج

(جنوبی منطقے کی کونسل اور لسانی اقلیتیں)

جنوبی منطقے کی کونسل نے لسانی اقلیتوں کے متعلق اپنا فیصلہ دوسرے منطقوں کی کونسلوں کو اطلاع کے لئے بھیج دیا ہے۔ اگست میں وزیر داخلہ نے ریاستوں کے بڑے وزیروں کی کانفرنس بلائی ہے تاکہ تمام ریاستوں میں ایک ہی پالیسی پر عمل درآمد ہوسکے۔ دیکھنا ہے کہ شمالی منطقے کی کونسل اس کانفرنس سے پہلے ہوتی ہے یا نہیں۔ اب تک شمالی منطقے کی کونسل نے لسانی اقلیتوں کے مسئلے پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے۔ جنوبی منطقے کی کونسل نے بہت اچھے فیصلے کئے ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خلاصہ یہاں درج کر دیا جائے اور ان سے جو نتائج نکلتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے۔

۱۔ آندھرا، کیرل، مدراس اور میسور میں یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو اقلیتوں کے لئے علٰحدہ جماعتوں، علٰحدہ اسکولوں اور استادوں کی جو سہولتیں موجود تھیں وہ نہ صرف جاری رہیں گی بلکہ ان میں حسب ضرورت اضافہ ہوگا۔ اگر طلبہ کی تعداد کم ہوگئی تو یہ سہولتیں بھی کم ہو جائیں گی، مگر کمی کی اجازت حکومت دے گی۔ اگر تعداد بڑھ گئی تو مزید سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ اگر کوئی ریاست استادوں کی تعداد اور بڑھانا چاہتی ہے تو اسے اس کی اجازت ہوگی۔

۲۔ اسکول کے سال کے شروع ہونے سے تین مہینے پہلے سے پندرہ دن پہلے تک ہر اسکول میں ان سرپرستوں کی طرف سے عرضیاں لی جائیں گی جو اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دلوانا چاہتے ہیں۔ یہ عرضیاں ایک رجسٹر میں درج کی جائیں گی اور محکمہ اس بات کا انتظام کرے گا کہ ہر بچے کا داخلہ ہو جائے۔

۳۔ حکومت اقلیتوں کے ایسے طلبہ کے لئے جو اپنی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ چوتھے درجے سے علاقائی زبان کو ایک مزید اختیاری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کا مناسب انتظام کرے گی تاکہ یہ طلبہ علاقائی زبان میں کمزور نہ رہ جائیں۔

۴۔ ان تمام تعلقوں یا میونسپلٹیوں کی فہرست بنائی جائے جہاں ۱۵ فی صدی اشخاص، علاقائی زبان کے علاوہ کوئی زبان بولتے ہیں اور ان کو ایک علٰحدہ لوکل ایریا تصور کیا جائے تاکہ یہاں اس زبان کو خاص خاص سرکاری معاملات کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ ان مخصوص خطوں میں حسب ذیل انتظامات کئے جائیں۔

(الف) حکومت کے تمام اہم اعلان، قواعد اور ووٹروں کی فہرستیں اقلیتوں کی زبان میں شائع ہوں۔

(ب) عوام جو فارم استعمال کرتے ہیں وہ علاقائی زبان کے علاوہ اقلیت کی زبان میں بھی چھاپے جائیں۔

(ج) اقلیت کی زبان میں کاغذات کی رجسٹری کے لئے سہولتیں مہیا کی جائیں۔

(د) سرکاری دفتروں سے خط و کتابت اقلیت کی زبان میں کرنے کی اجازت ہو۔

(ہ) ان خطوں کی عدالتوں میں اقلیت کی زبان میں عرضیاں اور دستاویزیں دئے جانے کی اجازت ہو۔

(و) جس حد تک انتظامی ضروریات اجازت دیں یہ کوشش کی جائے کہ ان خطوں کے افسر، اقلیت کی زبان سے اچھی طرح واقف ہوں۔

۵۔ ریاستی ملازمتوں کے لئے مقابلے کے جو امتحان ہوتے ہیں اُن میں انگریزی ہندی یا علاقائی زبان کے علاوہ اقلیت کی زبان میں بھی جواب دینے کی اجازت ہو بشرطیکہ اقلیت کی آبادی ریاست کی آبادی کی پندرہ سے بیس فی صدی تک ہو۔ جب کبھی جوابات کی زبان انگریزی کے بجائے علاقائی زبان کی جائے تو اقلیتوں کو انگریزی یا ہندی میں جواب دینے کی اجازت ہو۔

۶۔ جنوبی منطقے کی کونسل نے تامل، تلیگو، کنڑ، ملیالم اور اُردو کو اپنے دائرے میں اقلیتوں کی زبانیں تسلیم کیا ہے۔

جنوبی ہند نے اس فیصلے کے ذریعہ ظاہر کر دیا ہے کہ وہ لسانی اقلیتوں کے تمام جائز مطالبات کو تسلیم کرکے قومی وحدت اور سالمیت کی راہ سے ہر کانٹا دور کرنا چاہتا ہے۔ کاش شمال کو جنوب کی اس صحت مند روش پر چلنے کی توفیق ہو۔ اب اس مسئلے پر مزید لیت و لعل سے ملک کی ترقی کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے

اِدھر اُدھر سے

دُنیا میں برطانوی کتابوں کی مانگ

ایک اندازہ کے مطابق ۱۹۶۰ء کے دوران برطانوی پبلشروں نے تقریباً ۵۵،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ (۱۰۰ کروڑ روپے) کا کاروبار کیا اور اس میں سے ایک تہائی سے زائد رقم سمندر پار کے ملکوں سے وصول ہوئی۔

۱۹۶۰ء کا کاروبار ۱۹۵۹ء کے کاروبار سے ۱۰ فی صدی زیادہ تھا اور دس سال قبل کے کاروبار سے دوگنا اور جنگ سے قبل کے کاروبار سے تقریباً سات گنا تھا۔

برطانیہ جتنی کتابیں برآمد کرتا ہے اتنی دنیا میں کوئی اور ملک نہیں کرتا۔ اس کی تعلیمی، ٹیکنیکل اور اسی قسم کی دیگر کتابیں دنیا بھر کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے دوران میں برطانیہ میں تقریباً ۱۷، ۷۹۴ نئی کتابیں شائع ہوئی تھیں —— یعنی ہفتہ میں ۳۴۲۔ اگر ان مطبوعات میں پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن بھی شامل کرلئے جائیں تو تعداد ۲۳، ۷۸۳ ہو جاتی ہے۔ یہ تعداد سنہ ۱۹۵۹ء کی تعداد سے تقریباً ۲۳۰۰ زیادہ ہے۔

ہندی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا فیصلہ

اورینٹل کالج نارائن گوڑہ کی گورننگ کونسل نے جس کا جلسہ شریمتی سوشیلا دیوی ودیالنکارتا کی صدارت میں منعقد ہوا، حیدرآباد میں ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ہندی ریسرچ اسکالرس کے لئے ایک اچھا کتب خانہ فراہم کیا جاسکے۔

اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تفصیلات تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کے ارکان حسب ذیل ہیں:-

ڈاکٹر رام نرنجن پانڈے صدر شعبۂ ہندی عثمانیہ یونی ورسٹی۔ ڈاکٹر وجے پال سنگھ صدر شعبۂ ہندی سری وینکٹیشور یونیورسٹی۔ مسٹر سندر ریڈی صدر شعبۂ ہندی آندھرا یونی ورسٹی۔ مسٹر بی۔ این۔ چترویدی صدر شعبۂ جغرافیہ عثمانیہ یونی ورسٹی۔ ڈاکٹر ڈی پانڈورنگ راؤ ہندی اسپیشل آفیسر حکومت آندھرا پردیش۔ ڈاکٹر راج کشور پانڈے ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی۔ شریمتی سوشیلا دیوی اور مسٹر راج کمار کھنڈوال۔

ڈاکٹر ونشی دھر ودیالنکار پرنسپل اورینٹل کالج انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہوں گے۔

ہندی انسائیکلوپیڈیا کی تیاری

مرکزی وزیر تعلیم اور ناگری پرچارسبھا بنارس کے نمائندوں کا حال میں ایک خاص جلسہ ہوا جس میں ہندی انسائیکلوپیڈیا کے تیار کرنے کے متعلق پالیسیوں کو وضع کرنے کے لئے ایک آزاد بورڈ کی تخلیق کی سفارش کی گئی۔

بتایا گیا ہے کہ مرکزی وزارت تعلیم کے جوائنٹ سکریٹری شری آر پی نائک نے اس جلسہ کی صدارت کے فرائض انجام دئے تھے۔

کلاسیکی ادب کی اشاعت کا منصوبہ

معلوم ہوا ہے کہ اردو ترقیاتی بورڈ پاکستان نے لندن کی انڈیا آفس لائبریری سے بعض نادر اور کمیاب اردو کتابوں کے میکروفلم منگوائے ہیں۔ اس کے علاوہ بورڈ نے اردو کلاسیکی ادب شائع کرنے کا منصوبہ بھی بنایا ہے، اور عنقریب کئی کتابیں بازار میں آجائیں گی۔ بورڈ کی نائب صدر بیگم شائستہ اکرام اللہ نے بچوں کے لئے چند کتابیں لکھی ہیں اور اردو کے پرانے رسالوں پھول، تہذیب نسواں وغیرہ کا انتخاب بھی شائع کیا جارہا ہے۔

اقبال اکیڈیمی پر ایک لاکھ روپیہ سالانہ خرچ ہو رہا ہے

حکومت پاکستان اقبال اکیڈیمی پر ہر سال ایک لاکھ روپے خرچ کر رہی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان میں اور دوسرے ممالک میں علامہ اقبال کی تعلیمات کا پرچار کیا جائے۔ یہ اکیڈیمی سنہ ۱۹۵۱ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس وقت اسے حکومت کی طرف سے ۲۵ ہزار روپے سالانہ کی امداد ملتی تھی۔ بعد سنہ ۱۹۶۰ء میں مالی امداد دوگنی کر دی گئی اور موجودہ حکومت نے اسے بڑھا کر ۷۵ ہزار کر دیا اس کے بعد سنہ ۷۱-۱۹۶۹ء میں پچیس ہزار روپے کی خاص امداد اکیڈیمی کے لئے منظور کی گئی۔ جب سے یہ اکیڈیمی قائم ہوئی ہے، حکومت سے کم و بیش پانچ لاکھ روپے کی گرانٹ حاصل کر چکی ہے پچھلے سال اس اکیڈیمی نے ریسرچ اور کتابوں کی اشاعت پر ساڑھے تین لاکھ روپے خرچ کئے تھے اور اس دوران بارہ کتابیں چھاپی گئیں۔

لسانی درآمد برآمد

اردو	بنگلہ	اردو	بنگلہ
تفاوت	تُاپھات	قلم	کولوم
شروع	شُورُو	کاغذ	کاگوج
فقیر	پھوکیر	حکم	ہوکوم
معرفت	مار پھوت	زمین	جومی
وزیر	اُوجیر	شہر	شوہور
خطاب	کھیتاب	علم	اے لے م
بادشاہ	بادوشا	خبر	کھوبور
حضور	ہُوجُور	قاعدہ	کائےدا

(ا۔ ک)

اختر رضوانی کی خدمات کا اعتراف

مشہور رباعی گو شاعر جناب اختر رضوانی کی ۵۰ سالہ علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ۸ جولائی کو پنجاب کی راجدھانی چنڈی گڑھ میں ایک ادبی تقریب ہو رہی ہے جس کی صدارت پنڈت امرناتھ ودیالنکار وزیر تعلیم پنجاب کریں گے اور پروفیسر لیشونت رائے نائب وزیر بلدیات اختر صاحب کو ایک ہزار روپے کی تھیلی پیش کریں گے۔ اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہوگا۔

ضروری گزارش

براہ مہربانی انجمن سے متعلق جملہ خط کتابت اور ارسال زر "جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ" کے پتے پر فرمائیے۔
بعض خطوں پر منصب کی بجائے نام لکھا ہوتا ہے ایسے خطوں کی تعمیل میں مختلف وجوہ سے دیر ہو جاتی ہے جس کے نام خط لکھا گیا ہے اگر وہ کارکن چھٹی پر ہو، بیمار ہو، دورے میں ہو یا عدم موجودگی کی کوئی اور صورت ہو تو وہ ڈاک کھلتی نہیں اور اہم خطوط کا جواب بروقت نہیں دیا جاسکتا
اس لئے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے خط "جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ یو۔پی" کے پتے پر بھیجئے۔ شکریہ

جگن ناتھ آزاد

غزل

اک شہر نے پایا ہے گو میرے قریں تجھ کو
میں نے تو مگر اب تک دیکھا ہی نہیں تجھ کو
پائی تری قربت میں تیری ہی کمی میں نے
اللہ کرے اس کا آئے نہ یقیں تجھ کو
دنیا سے گلہ کیا ہو دنیا تو ہے بیگانی
بیتابیٔ دل! میری کیوں فکر نہیں تجھ کو
اب دیکھ کے تو مجھ کو انجان نہ بن اتنا
احساسِ خطا اک دن کر دے نہ غمیں تجھ کو
حیرت ہے مجھے اس پر اللہ نے کیوں آخر
دیندار بنایا ہے اے دشمنِ دیں تجھ کو
فرقت میں بھی بیتابی، قربت میں بھی بیتابی
پھینک آؤں کہاں آخر اے قلبِ حزیں تجھ کو
تیری ہی تجلی سے روشن ہے غزل میری
اور تو ہے کہ اتنا بھی معلوم نہیں تجھ کو

حسبا فاضلی

غزل

جب بھی تیری گلی سے گزرے ہیں
بن کے ہم اجنبی سے گزرے ہیں
کچھ نہ کچھ بات ہے کہ دیوانے
آج کچھ خامشی سے گزرے ہیں
خارزاروں کا کچھ قصور نہیں
ہم ہی وارفتگی سے گزرے ہیں
حاصلِ زیست بن گئے وہ دن
جو تری بے رخی سے گزرے ہیں
ہنسنے والو! نہ آنسوؤں کو چھپاؤ
ہم بھی ایسی ہنسی سے گزرے ہیں

بھاگیرتھ لال زخمی

غزل

زیست میں شدتِ آفات کہاں تھی پہلے
چرخ کے جور میں یہ گھات کہاں تھی پہلے
اس قدر تلخیٔ حالات کہاں تھی پہلے
غم و آلام کی بہتات کہاں تھی پہلے
وقت کا ایک تقاضہ اسے کہہ سکتے ہیں
ورنہ یہ صورتِ حالات کہاں تھی پہلے
یوں تو ہر شے کو تغیر بھی ہوا کرتا ہے
بات جو آج ہے وہ بات کہاں تھی پہلے
غمِ دوراں کی عنایت اسے کہئے ورنہ
زندگی صرفِ خرابات کہاں تھی پہلے
ہر طرف جام و سبو رقص کناں تھے زخمی
اتنی بے کیف مری رات کہاں تھی پہلے

مظہر امام

فریبِ خرد

وہ بھی تیرے ساز کا تھا اک سرودِ مضمحل
جس کو اپنے قلبِ محزوں کی فغاں سمجھا تھا میں
رہگزر پر جا بجا تھے اپنے ہی سجدوں کے داغ
اور انھیں کو تیرے قدموں کے نشاں سمجھا تھا میں
تھا تصور کے چراغِ کشتہ کا وہ بھی دھواں
جس کو اپنی سادگی سے آسماں سمجھا تھا میں
میرے صحرائے تخیل کا وہ اک دیوانہ تھا
جس کو اپنا ہم ضمیر و ہم زباں سمجھا تھا میں
ختم تھی بس ان کے اک سادہ اشارے پر امام!
زندگی کو داستاں در داستاں سمجھا تھا میں

توقیر قمر للت پوری

غزل

نگاہِ حسنِ طلب جب بھی ہم اٹھائیں گے
زمیں پہ چاند ستارے بھی توڑ لائیں گے
بجا کہ تجھ سے بچھڑ کر سکوں نہ پائیں گے
غمِ جہاں کو مگر کس طرح منائیں گے
ہزار آبلے پھوٹیں ہزار خار چبھیں
جو بڑھ چکے ہیں قدم لوٹ کر نہ آئیں گے
زمانہ غیر ہمیشہ سے ہے وفا دشمن
خبر نہ تھی کہ ہمیں وہ بھی بھول جائیں گے
بجھی بجھی سی ہے شمعِ حیات تو کیا غم
ہم اپنے خونِ جگر سے اسے جلائیں گے
خبر یہ ہوتی تو کیوں آتے بزمِ الفت میں
کہ صرف ہم ہی یہاں غیر سمجھے جائیں گے

انور بھوپالی

غزل مسلسل

جلوہ گر پھر ان کا حسنِ یاسمیں ہونے کو ہے
وقفِ سجدہ پھر مرے دل کی جبیں ہونے کو ہے
سوزِ غم لینے کو ہے پھر کروٹوں پر کروٹیں
پھر فضائے ساز نغمہ آفریں ہونے کو ہے
"پھر کوئی بالائے بام آرزو آنے کو ہے"
ذرہ ذرہ خاکِ دل کا پھر جبیں ہونے کو ہے
پھر میں دیپک کے سُروں میں چھیڑتا ہوں سازِ غم
پھر مرا ہر بول آہِ آتشیں ہونے کو ہے
بے خودی پھر کر رہی ہے سلسلہ جنبانیاں
پھر گمانِ زیست پہ حق الیقیں ہونے کو ہے
میری غیرت پھونک کر رکھ دے گی پھر انور مجھے
میری حالت پر وہ محجوبِ حزیں ہونے کو ہے

سلام بن رزاق پنویلی

قطعہ

مجھ پہ الزام لگانے ہو لگا لو لیکن
تم نے الزام سے دامن بھی بچایا کب ہے
تم پئے قتل چلے آتے ہو شمشیر بکف
ہم نے سر تیغ کے نیچے سے ہٹایا کب ہے

شبیر احمد غوری، الہ آباد

رباعیاتِ عمر خیام میں الحاق

مولانا ناطق نے "سبع سیارہ" کے اندر عمر خیام کی شاعری سے انکار کیا تھا اور لکھا تھا:- "یہ جو رباعیاں اس سے منسوب کی جاتی ہیں عمر خیام کی نہیں ہیں...... عمر خیام اپنے دور علم اور ذوق سلیم کے مطابق متقدمین کی بہتر سے بہتر رباعیاں جو کہ ایک بیاض میں جمع کر گیا جو اس کے بعد ملیں اور لوگوں نے اس کی مستقل ملکیت پر خیال کر کے رباعیوں کو اسی سے منسوب کر دیا۔"

مولانا کے اس انکشاف پر تبصرہ "ہماری زبان" میں پہلے اے ایچ انصاری گورکھپور کے استفسار کے جواب میں اور پھر "سبع سیارہ" پر ریویو کے ضمن میں شائع ہو چکا ہے۔ خیال تھا کہ ان توضیحات سے ناطق صاحب کی غلط فہمی رفع ہو گئی ہوگی۔ مگر ۲۲ مئی کے "ہماری زبان" میں انھوں نے پھر لکھوایا ہے:- "عمر خیام کی رباعیات کے سلسلے میں ضیاء احمد صاحب کو بھی اعتراف ہے کہ بہت سی الحاقی رباعیاں اس سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ تبصرہ نگار صاحب کو بتانا چاہئے کہ وہ کونسی رباعیات ہیں اور ان میں کتنی متقدمین شعراء فارسی کی ہیں اور کتنی متاخرین کی۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ سب رباعیات متقدمین کی ہیں جن میں سنائی وغیرہ شامل ہیں۔ متاخرین میں شاید کسی ایک کی بھی نہ ہو۔ جب یہ بات ہے تو پھر ہم یہ فیصلہ کیوں نہ کریں کہ وہ سب رباعیاں بجائے الحاق ہونے کے عمر خیام کی جمع کی ہوئی ہیں خود عمر خیام کی نہیں ہیں۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف بڑے شدید قسم کی غلط فہمی میں گرفتار ہیں۔ اس لئے مسئلہ پر از سر نو نظر ڈالنا ضروری ہے۔ "سبع سیارہ" میں مولانا موصوف نے سب سے زیادہ موثر اور آخری دلیل یہ دی ہے:- "اٹھارہ بیس سال کا عرصہ ہوا مجھے ایک فارسی شاعر کے دیوان میں جس کا زمانہ خیام سے مقدم ہے عمر خیام کی ایک رباعی نظر آئی تو میں اسے لکھنؤ لے گیا اور مولانا آسی مرحوم کو بتایا...... مولانا نے یہ بتایا کہ عمر خیام کی ایک اور رباعی بھی انھوں نے فارسی کے کسی پرانے شاعر کے دیوان میں دیکھی ہے...... اور تقریباً ایک سال کے بعد مجھے لکھا کہ عمر خیام کی اور بھی کئی رباعیاں دیگر متقدمین کے مجموعوں میں مل گئی ہیں اور رفتہ رفتہ آسی صاحب کے انتقال کے ایک سال پہلے جو مجھ سے ان سے آخری میں ملاقات ہوئی تو یہ بتایا کہ اب خیام کے مجموعہ میں تقریباً ستر اسّی رباعیاں ایسی ہیں جو مجھے کہیں اور نہیں ملی ہیں۔ میں نے کہا ثبوت کے لئے دس رباعیاں بھی کافی ہیں...... مگر افسوس ہے کہ انکی عمر نے وفا نہیں کی...... ورنہ خیام کی ایک ایک رباعی کا ماخذ سامنے آ جاتا۔"

حضرت مولانا کا یہ استدلال سطحیت اور قلت مطالعہ پر مبنی ہے۔

۱- ناطق صاحب کا خیال ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ خیام کی رباعیاں دوسرے شعراء کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ یہ مسئلہ ہر محققین پہلے معلوم کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں بہت کچھ تحقیقات ہو چکی ہے۔ مولانا نے یہ مضمون ۱۹۵۱ء میں بھارت کے ایک جریدہ کے اندر شائع کرایا تھا لہٰذا ان کے حساب سے وہ اور ان کے استاد مل کر ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں اس قسم کی صرف دو رباعیاں دریافت کر سکے تھے حالانکہ اس وقت تک اس قسم کی تقریباً سوا سو رباعیاں دریافت ہو چکی تھیں جو خیام اور دیگر شعراء کے یہاں مشترک ہیں۔ پچھلی صدی تک روسی مستشرق ژوکوفسکی نے اس قسم کی بیاسی رباعیاں دریافت کی تھیں۔ بعد میں کرسٹن سن ڈینی سن اس اور آنجہانی مسٹر ہیرن ایلن نے اس قسم کی تقریباً چھبیس رباعیاں اور دریافت کیں یعنی جب مولانا ناطق کو اس قسم کی پہلی رباعی ملی تھی اس سے کہیں عرصہ پیشتر محققین سو سے زیادہ اس قسم کی رباعیاں دریافت کر چکے تھے۔ اس کے بعد ہندوستان میں سید سلیمان ندوی مرحوم نے ۱۹۳۳ء سے قبل اس قسم کی اٹھائیس رباعیاں اور دریافت کیں یعنی ابھی مولانا ناطق کو اس قسم کی ایک رباعی بھی نہ ملی تھی کہ ارباب تحقیق سوا سو کے قریب ایسی رباعیاں ڈھونڈ چکے تھے جو خیام اور دیگر شعراء فارسی کے یہاں مشترک ہیں۔ کاش مولانا ناطق نے وسعت مطالعہ سے کام فرمایا ہوتا تو اس "دریافت" تحقیق کو اس درجہ سرمایۂ فخر و مباہات نہ گردانتے۔

۲- خود مولانا کو اعتراف ہے کہ آسی مرحوم کی تلاش کے مطابق خیام کے مجموعہ میں تقریباً ستر اسّی رباعیاں ایسی بھی ہیں جو کہیں اور بھی ہیں۔ اور بقول مولانا ناطق "ثبوت کے لئے دس رباعیاں بھی کافی ہیں۔"

۳- لیکن مشترک رباعیات کے متعلق بھی ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ بغیر کسی ایجابی دلیل کے محض اس بنا پر کہ کوئی رباعی خیام کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے دیوان میں بھی ملتی ہے اسے خیام کی ملکیت سے خارج کر دیں۔ ہاں اگر کوئی رباعی خیام کے علاوہ متقدمین میں سے بھی کسی کی طرف منسوب ہے اور ایسے مخطوطہ میں پائی جاتی ہے جو خیام سے پہلے لکھا گیا تھا تو یقیناً اسے خیام کی ملک سے باہر سمجھا جانا چاہئے مگر ہنوز کوئی ایسا مسئلہ سامنے نہیں آیا۔ اسی طرح اگر کوئی رباعی خیام کے علاوہ متاخرین میں سے بھی کسی کی طرف منسوب ہے اور رباعیات کے ایسے نسخے میں پائی جاتی ہے جو اُس شاعر سے پہلے لکھا گیا تھا تو یقیناً اس شاعر کی ملکیت سے خارج اور خیام کی ملک سمجھی جائے گی مثلاً ایک رباعی خیام اور طالب آملی (المتوفی ۱۰۳۶ھ) دونوں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ مگر وہ رباعیات کے مخطوطہ بوڈلین میں موجود ہے جو ۸۶۵ھ کا لکھا ہوا ہے (یعنی طالب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل) اس لئے یہ طالب کی نہیں ہو سکتی، بلکہ خیام کی ملک ہے۔ پھر بھی کچھ رباعیاں ایسی رہ جاتی ہیں جن کا اس طرح دو ٹوک فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں پر مورخ کے حدود ختم ہو جاتے ہیں اور ادیب کا میدان آتا ہے جو زبان کے سبک اور خیالات کے تقابلی مطالعے کے بعد فیصلہ کرے گا کہ مختلف فیہ رباعی کس کی ہے۔

مثلاً مندرجہ ذیل رباعی (بادنیٰ تغیر) خیام کے مجموعہ میں بھی ہے اور مجمع الفصحاء میں فارابی کی طرف منسوب ہے۔

اسرار وجود خام و پختہ بماند — وان گوہر بس شریف ناسفتہ بماند
ہر کس ز سر قیاس حرفے گفتند — واں نکتہ کہ اصل بود ناگفتہ بماند

فارابی رودکی اور شہید بلخی وغیرہ کا معاصر تھا مگر اس رباعی کی زبان اور سبک ان لوگوں کی زبان اور سبک سے قطعاً مختلف ہے۔ پھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ فارسی الاصل ہونے اور دنیا کی متعدد زبانیں جاننے کے باوجود فارابی نے فارسی میں کچھ نہیں لکھا۔ جوانی سے لے کر وفات تک اُسکی ساری زندگی بغداد اور شام میں گزری جہاں فارسی بولنے اور لکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ جیسا کہ عباس محمود عقاد نے لکھا ہے:- "ایک یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ فارابی نے فارسی یا ترکی زبان میں کوئی تصنیف نہیں کی" (فارابی مترجمہ میں احمد جعفری ص ۲۶) اس لئے یہ رباعی فارابی کی نہیں ہو سکتی لہٰذا اسے خیام کی ملکیت سے کیوں خارج کیا جائے۔

اسی طرح مجمع الفصحاء میں شیخ بوعلی سینا کی طرف پانچ رباعیاں منسوب ہیں، ان میں سے تین خیام کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ قرائن مقتضی ہیں کہ ان تینوں کو خیام کی ہوں مثلاً

کفر چو منی گزاف و آساں نبود　　　محکم تر از ایمان من ایمان نبود
در دہر چو من یکے و آں ہم کافر　　　پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

ظاہر ہے کہ شیخ پر اسکی زندگی میں کفر کا فتوی نہیں لگا مگر خیام پر یہ افتاد پڑی اور اس شدت سے پڑی کہ گھر سے نکلنا بند ہو گیا۔ ابن القفطی لکھتا ہے:۔

"ولما قدح اہل زمانہ فی دینہ واظہروا ما اسروہ من مکنونہ خشی علی دمہ وامسک من عنان لسانہ وقلمہ"

(اخبار العلماء باخبار الحکماء صفحہ ۱۶۳)

اس لئے یہ رباعی شیخ بوعلی سینا کے بجائے خیام ہی کی ملک ہے۔ یا مثلاً

با این دو سہ نادان کہ چنیں می دانند　　　از جہل کہ دانائے جہاں آنند
خر باش کہ این جماعت از فرط خری　　　ہر کو نہ خراست کافرش می خوانند

یہ زمانہ کی ناقدری کے ہاتھوں ستائے ہوئے ایک باکمال ہی کی صدائے دلخراش ہو سکتی ہے اور وہ خیام تھا چنانچہ "کتاب الجبر والمقابلہ" میں جھوٹے مدعیان علم و فضل کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"واکثر المتشبہین بالحکماء فی زماننا..... ان شاہدوا انسانا معنیا بطلب الحق وایثار الصدق مجتہدا فی رفض الباطل والزور وترک المراءاۃ والخداع استخفوہ وسخروا منہ"

لہذا یہ رباعی خیام ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ شیخ کے زمانہ میں علم و فضل کی اس درجہ ناقدری و کساد بازاری نہیں ہوئی تھی۔

غالباً اس طرح بہت سی مشکوک رباعیوں کی حقیقت صاف ہو جائیگی۔ ممکن ہے کچھ رباعیات پھر بھی رہ جائیں مگر اس سے اصل مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ اس قسم کی رباعیات اس دعوی کی موید نہیں ہو سکیں گی کہ خیام کا مجموعہ رباعیات اس کا اپنا نہیں تھا بلکہ متقدمین کی چیدہ رباعیات کا انتخاب تھا۔

۴۔ لیکن میرے خیال میں مولانا ناطق کی غلط فہمی کا سب سے بڑا موجب یہ بے بنیاد خیال ہے کہ "وہ سب رباعیات متقدمین کی ہیں جن میں سنائی وغیرہ شامل ہیں۔ متاخرین میں سے شاید کسی ایک کی بھی نہ ہو" (ہماری زبان ۲۲ مئی سنہ ۱۹۶۱ء) لیکن اگر بالفرض وہ مشترک رباعیات صرف متقدمین ہی کے دیوان میں پائی جاتیں تب بھی اس سے مولانا ناطق کا دعوی ثابت نہیں ہوتا (تفصیل اوپر گذر چکی)

(ج) مگر موصوف کا یہ دعوی بھی کہ "متاخرین میں سے شاید کسی ایک کی بھی نہ ہو" صحیح نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ایک رباعی کے علاوہ ان کی نظر سے اس قسم کی اور کوئی مشترک رباعی گزری ہی نہیں اور جو کچھ اعجوبہ تراشی فرمائی ہے وہ آسی مرحوم کے "شمسی تا سنائی" باتوں ہی کی بنا پر ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ناطق صاحب جناب ضیاء احمد صاحب بدایونی سے یہ مطالبہ کرنے کے بجائے کہ "ان الحاقی رباعیات میں کتنی متقدمین شعراء فارسی کی ہیں اور کتنی متاخرین کی" بنفس نفیس لکھنؤ جا کر آسی مرحوم کے ذخیرے میں تلاش کرتے۔

بہرحال موصوف کی غلط فہمی کے ازالے کے لئے یہ بتا دینا مستحسن ہوگا کہ متقدمین میں ایسے شعراء کی تعداد جن کی طرف خیام کی بعض رباعیات منسوب ہیں، ان متاخرین شعراء فارسی کی تعداد سے کم ہے جو خیام کے بعد ہوئے ہیں اور جن کی طرف خیام کی بعض رباعیات منسوب ہیں۔ خیام کے پیشرو وہ ہیں جن کی طرف اسکی بعض رباعیات منسوب کی جاتی ہیں۔ فارابی، بوعلی سینا، شیخ ابوالحسن خرقانی، شیخ ابوسعید ابوالخیر، باباطاہر، افضل الدین کاشی، باخرزی (صاحب دمیۃ القصر) ابو اسمٰعیل عبداللہ انصاری ہیں۔ ان کے مقابلہ میں وہ شعراء جو خیام کے بعد ہوئے ہیں اور جن کی طرف اسکی رباعیات منسوب ہیں احمد بدیلی سبزواری، خواجہ فریدالدین عطار، جلال الدین رومی، فخرالدین رازی، سیف الدین باخرزی، نجم الدین رازی، نصیرالدین طوسی، سراج الدین قمری، مجدالدین ہمگر، انوری، مغربی تبریزی، کمال اسمٰعیل، حافظ، شاہ شجاع (ممدوح حافظ)، ابویزید مظفر (پدر شاہ شجاع مذکور)، بیہقی سجاوندی، طالب آملی وغیرہ ہیں۔

اسکے بعد ناطق صاحب کا یہ ادعا کہ "متاخرین میں شاید کسی ایک کی بھی نہ ہو" ادعائے باطل سے زیادہ وقیع نہیں رہتا۔ طالب آملی (المتوفی سنہ ۱۰۳۶ھ) کا ذکر اوپر آچکا ہے جس کی طرف خیام کی ایک رباعی منسوب ہے۔ اس سے زیادہ مشہور حسب ذیل رباعی ہے جو محقق نصیرالدین طوسی (المتوفی ۶۷۲ھ) کی جانب منسوب ہے:۔

اجزائے پیالہ کہ در ہم پیوست　　　بشکستن آں روا نمی دارد مست
چندیں سر و پائے نازنیں و کف دست　　　از بہر چہ ساخت و از برائے چہ شکست

آتشکدہ آذر میں لکھا ہے کہ محقق طوسی نے یہ رباعی کہہ کر بابا افضل کاشانی کے پاس برائے جواب بھیجی تھی۔ محقق کی اخلاق ناصری (مطبوعہ کلکتہ ۱۲۶۹ء) کے دیباچہ (حالات مصنف) میں بھی اس رباعی کو انہیں کی طرف منسوب لکھا ہے مگر عطا ملک جوینی نے سنہ ۶۱۹ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ عزالدین نسائی نے یہ رباعی خیام کے نام سے پڑھی تھی اس لئے یقیناً محقق طوسی کی نہیں ہے۔ مزید امثلہ کا ایراد موجب تطویل ہوگا۔

(ب) یہ بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ مولانا ناطق متقدمین و متاخرین کا امتیاز بھی کماحقہ نہیں کر سکے ہیں اور شاید بہت سے متاخرین کو متقدمین سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس شبہ کو ناطق صاحب کے اس جملے سے تقویت ہوتی ہے:۔

"وہ سب رباعیات متقدمین کی ہیں جن میں سنائی وغیرہ شامل ہیں"

حالانکہ سنائی عمر خیام سے مقدم نہیں بلکہ متاخر ہیں۔ خیام کا سال وفات سنہ ۵۱۵ھ اور سنہ ۵۲۶ھ کے مابین ہے اور سنائی کا سال وفات غالباً سنہ ۵۴۵ھ ہے۔ اس سے قطع نظر جس انداز میں سنائی نے خیام کو خط لکھا ہے اس سے خیام کی بزرگی اور سنائی کی خوردی میں کوئی شک نہیں رہتا۔ مگر مولانا ناطق کو اصرار ہے کہ سنائی خیام کے متقدمین میں ہیں۔ فیا للعجب!

بہرحال چونکہ مولانا ناطق کی اس غلط فہمی کا منشاء ان کا یہ خیال ہے کہ "وہ سب رباعیات متقدمین کی ہیں جن میں سنائی وغیرہ شامل ہیں۔ متاخرین میں شاید کسی ایک کی بھی نہ ہو" اور چونکہ اس کی سقاہت مذکورۃ الصدر تفصیل سے بے نقاب ہو چکی ہے اس لئے ان کا یہ فیصلہ نادرست ہے کہ "وہ سب رباعیاں بجائے الحاقی ہونے کے عمر خیام کی ہیں جتنی کی ہوئی ہیں، خود عمر خیام کی نہیں ہیں" اور غالباً اب وہ اس باطل پر اصرار نہ فرمائیں گے۔

انجمن کا خبرنامہ

راجستھان میں "اُردو تعلیم کی منصوبہ بندی" کی ایک جھلک

جے پور۔ راجستھان میں تعلیم اُردو کے متعلق جو جدوجہد انجمن ترقی اُردو راجستھان کر رہی ہے۔ اس کے خوشگوار نتائج برابر منظر عام پر آ رہے ہیں۔ تاہم کارکنان انجمن کے عزائم سے باخبر ہوتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی منزل مقصود ابھی دور ہے۔ مگر ساتھ ہی ان کی سخت کوشش دیکھتے ہوئے توقع ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔

حال ہی میں اوقاف کی جائدادوں کے سروے کے سلسلے میں جو معلومات وقف کمشنری راجستھان نے مختلف امور کی بابت بہم پہنچائی ہیں ان میں سے صرف ایک کمشنری اجمیر کی بابت معلوم ہوا ہے کہ اس میں چھ سال سے سولہ سال تک کی عمر کے بچوں کی تعداد ایک لاکھ چون ہزار (۱۵۴۰۰۰) ہے جن سب کی مادری زبان بالیقین اردو ہے۔ غیر مسلم بچے جن کی مادری زبان اُردو ہے ان کے علاوہ ہیں۔ مگر یہ معلوم ہو کر افسوس ہے کہ ان میں سے صرف پانچ ہزار بچے ایسے ہیں جو پرائیویٹ مکتبوں یا سرکاری پرائمری اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ مگر ان پانچ ہزار میں سے بھی بڑی تعداد ایسی ہے جو مکتبوں میں قاعدہ بغدادی یا ایک دو سیپارہ پڑھ کر تعلیم ختم کر دیتے ہیں۔ اور پرائمری اسکول والے چوتھے پانچویں درجے پر جا کر رُک جاتے ہیں اس لئے معیاری وسطانی تعلیم تک سے محروم رہتے ہیں۔ یہ تعداد ایک ڈویژن راجستھان کی ہے۔ مسلم طلبہ میں اگر کچھ کی زبان اردو نہ بھی ہو تو ایسی ہی غیر مسلم بچوں کی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ہم اسی تعداد کو اوسطاً صحیح مان کر حساب لگائیں اور تین تین سو بچوں پر بھی ایک ایک اسکول کھلوائیں تو اسکولوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچتی ہے۔ جبکہ اس ڈویژن میں بھی محدود سے چند اسکولوں میں اردو کی تعلیم جاری ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اُردو دوستوں میں جتنا قولاً جوش و خروش ہے اس سے کہیں زیادہ عملاً جمود و تعطل ہے۔ حالانکہ گورنمنٹ راجستھان صاف حکم جاری کر چکی ہے کہ پرائمری درجوں میں مقررہ تعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے طلبہ کو ان کی مادری زبان (اردو) ہی میں اسی زبان کی تعلیم دی جائے گی۔ اس طرح ان لوگوں کو مطمئن ہو جانا چاہئے تھا کہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اردو کی تعلیم بچے کو نہ ملی تو وہ مذہب نابلد رہ جائے گا۔ اسی طرح ایک دوسرے طبقہ کا یہ شبہ اور خیال بے اصل ہے کہ اگر پانچویں درجے تک بچے نے اردو پڑھی تو پھر چھٹے میں جا کر وہ بیکار ہو جائے گا کیونکہ ہندی سے ناواقف ہوگا۔ اس لئے کہ گورنمنٹ نے اس کا حل پہلے ہی کر دیا ہے کہ بچہ چھٹے میں پہنچ کر ہندی میں کمزور رہے۔ یہ کہ اس کو تیسرے کلاس سے بطور زائد مضمون ہندی بھی پڑھائی جائے گی تاکہ وہ چھٹے میں کمزور نہ رہ جائے۔ دراصل بیشتر اردو دوست مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت اور تعلیمی نکات سے بے خبر ہیں۔ ورنہ جب احکام مکمل طور پر نافذ ہو چکے تو عمل کرانا خود ان کا اس طرح فرض ہے کہ جہاں بے قاعدگی دیکھیں۔ حکام مجاز کو متوجہ کریں اور اپنا حق حاصل کریں۔ پھر بھی کوئی دشواری پیش آئے تو انجمن ترقی اُردو راجستھان تسلیم منزل۔ جے پور سے رجوع کریں۔ اپنا جائز حق مانگنے میں جس کو گورنمنٹ خود تسلیم کر چکی ہے نہ تو خوف زدہ ہونے کی ضرورت ہے نہ مادری زبان میں تعلیم کا سوال بغاوت یا پاکستانی ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے۔ پھر بلاوجہ خوف و ہراس کیوں؟ ہاں تو ایک لاکھ چون ہزار بچوں پر تین تین سو کے لئے بھی ایک اسکول ہو تو کتنے اسکول ہوں گے۔ اور پھر سو سو طلبہ پر ایک ایک مدرس یا فی اسکول تین تین ٹیچر ہوں تو حساب لگائیے ان کی کیا تعداد ہوگی۔ یہ ایک ڈویژن کا حال ہے جبکہ راجستھان کے پانچ ڈویژن ہیں۔ بلاشک اجمیر ڈویژن میں مسلم آبادی نسبتاً زائد ہے مگر دوسری کمشنریاں بھی ان سے خالی تو نہیں ہیں۔ اردو دوست از خود بیدار ہو جائیں تو بہتر ہے۔ ورنہ ۶۳ء میں جبکہ جبریہ تعلیم کی اسکیم راجستھان میں جاری ہونے والی ہے۔ انھیں لامحالہ اپنی اولاد کو پڑھانا تو پڑے ہی گا۔ کہیں اس وقت بھی کوئی غلطی نہ کر جائیں۔

(عبدالواسع اکمل۔ اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان)

انڈین مسلم کنونشن کی دو اہم تجاویز

اُردو انڈین مسلم کنونشن کا یہ اجلاس اس بات پر اظہارِ افسوس کرتا ہے کہ آزادی کے بعد جبکہ ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کے نشو و نما اور ترقی کے مواقع فراہم کئے جا رہے ہیں اور اُن کی ترویج و اشاعت سے دلچسپی لی جا رہی ہے اُردو کو اس کا آئینی حق بھی نہیں ملا ہے اس لئے ہندی مسلمانوں کا یہ نمائندہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ :-

(الف) جن علاقوں میں کل ہند انجمن ترقی اُردو نے اُردو کو آئین کی دفعہ نمبر ۳۴۷ کی رو سے علاقائی زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا ہے وہاں اس کو ثانوی زبان کا درجہ دیا جائے۔

(ب) جن غیر ہندی بولنے والے علاقوں میں اُردو کے لئے کل ہند انجمن ترقی اُردو کی جانب سے سہولتوں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ جلد از جلد دی جائیں اور ان کو انسٹی ٹیوٹ بک میں شامل کر کے باقاعدہ قانونی شکل دی جائے اور صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے اس طرح ڈائرکٹیو جاری کیا جائے جس طرح انگریزی کو ایسوسی ایٹ زبان قرار دینے کے لئے کیا گیا تھا۔

اُردو یونیورسٹی انڈین مسلم کنونشن کا یہ اجلاس اپنی قومی حکومت سے پُر زور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ہندوستان کے کسی مناسب مقام پر اُردو یونیورسٹی قائم کرے۔ مسلمہ طور پر اُردو زبان دستورِ ہند کی چودہ مسلمہ زبانوں میں سے ایک ہے جو ہمارے ملک کی ملی جلی تہذیب کی ایک بے مثال یادگار ہے۔ اُردو یونیورسٹی کے قیام سے ملک میں اُردو زبان کو جو فروغ حاصل ہوگا۔ وہ درحقیقت ہمارے اتحاد و اتفاق کی ان روایات کا فروغ ہوگا جن پر ہندوستان کے ہر گوشے میں قومی یکجہتی کی بنیادیں رکھی جا رہی ہیں اور جس کی بدولت ملک کی سالمیت و استحکام کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ یہ کنونشن توقع کرتا ہے کہ اُردو زبان سے محبت کرنے والے شہریوں کا جائز مطالبہ قبول کر کے بلا تاخیر ملک میں ایک اُردو یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کیا جائے گا۔

انجمن ترقی اُردو ناندیڑ کی تیسری سالانہ کانفرنس کی قراردادیں

انجمن ترقی اُردو کی تیسری سالانہ کانفرنس میں منظور شدہ قراردادوں میں کہا گیا ہے کہ سرکاری مدارس کو خانگی ادارہ جات کے حوالے کرنے کی تجویز میں مزید اضافے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ابھی اُردو داں طبقہ کی معاشی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ اُردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کو اپنے ہاتھ میں لے سکے اس لئے موجودہ صورت حال میں مذکورہ تجویز کی منظوری اُردو کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس تحریک کو مسٹر وی۔ ڈی دیشپانڈے نے پیش کیا اور محمود علی عشقی معتمد عمومی انجمن ترقی اُردو ناندیڑ نے تائید کی جسے کثرت آراء سے منظور کر لیا گیا۔ ایک قرارداد کے ذریعہ حکومت مہاراشٹرا اور بالخصوص محکمۂ تعلیمات سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ لفظ ہندستانی کی جگہ اُردو کو شامل کرے چونکہ دستور کی مسلمہ چودہ زبانوں میں ہندستانی کوئی زبان نہیں ہے اس لئے مدارس میں ہندستانی جماعتوں کو اُردو جماعتیں قرار دیا جانا چاہئے۔ ایک قرارداد میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ مہاراشٹرا میں اُردو داں طبقے کی تعداد پندرہ فی صد سے زیادہ ہے اس لئے اُردو جماعتوں کی برقراری کے لئے کم از کم طلبہ کی تعداد دس قرار دی جائے۔ ایک قرارداد میں مہاراشٹرا کے آل انڈیا ریڈیو میں اُردو کو مناسب موقع دینے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مرہٹواڑہ کے اُردو شاعر و ادیب حضرات کو بھی آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں نمائندگی دی جانی چاہئے۔ ایک دوسری قرارداد میں حکومت مہاراشٹرا سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ ریاست آندھرا پردیش کی طرح اسمبلی کے مباحث محکمۂ نشر و اشاعت کی جانب سے ماہانہ جریدے اور قبائلی کاموں کی تفصیل وغیرہ اُردو میں بھی شائع کرے۔ اس خصوص میں بھی نشر و اشاعت کے محکموں کو اُردو کے تعلق سے متوجہ کیا جانا چاہئے۔ چونکہ اس علاقے کی آبادی بھی پندرہ فی صد سے زائد ہے۔ ایک اور قرارداد میں ناندیڑ میں تین مدارس تحتانی نسواں کی برقراری کی اپیل کی گئی ہے تاکہ وسطانیہ اور فوقانیہ میں طالبات کی تعداد مطلوبہ حاصل ہو سکے۔ ایک دوسری قرارداد میں مہاراشٹر کے تمام صدور بلدیہ سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ مراٹھی کے ساتھ ساتھ اُردو میں دفتری کاروبار انجام دیں اور بالخصوص رائے دہندوں کی فہرست کا اُردو میں بھی شائع ہونا ازبس ضروری ہے۔ ایک اور قرارداد میں حکومت مہاراشٹر سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ مرہٹواڑہ کے اُردو مدرسین کے لئے اُردو ٹیچرس ٹریننگ کالج کے قیام کا فوری بندوبست کرے۔ کانفرنس نے اس کے لئے اورنگ آباد کو موزوں و مناسب مقام قرار دیا ہے۔ قراردادوں پر بحث میں مسٹر وی۔ ڈی دیشپانڈے ایم اے ایل اے و سابقہ اپوزیشن لیڈر م۔ خ شاذلی، محمود عشقی، چغتائی کامریڈ فخر الزماں خاں وغیرہ نے حصہ لیا۔ اور تمام قراردادیں متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔ اس سلسلے میں اُردو مجلس اور ایک محفلِ مشاعرہ کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔ مشاعرہ کی صدارت چغتائی اور اردو مجلس کی صدارت تحسین سروری نے کی۔ مشاعرہ میں حیدرآباد سے تحسین سروری، فضل جعفری الہ آبادی، مبشر نواز، اختر الزماں ناصر، امر سنگھ جوش محمد آبادی، محمود عشقی نے حصہ لیا۔ اجلاس کی کارروائی اختتام معتمد عمومی محمود عشقی کے شکریہ پر عمل میں آیا۔

بقیہ

قطب مشتری اور سب رس کے مصنف ملا وجہی کا فارسی دیوان

عالمے را ای کنم شاگردی از اعجاز طبع
وجہیا استاد اگر روح الامین باشد مرا

شرمندہ ہستم از ین بے زری وجہیؔ
کس حال من بہ شاہ دکن گفت یا نگفت

البتہ اپنی اردو شاعری میں شاعر نے وجہی اور وجہیؔ صرف دو تخلص اختیار کئے ہیں۔

وجہی نے اپنے بعض فارسی اشعار میں اپنے آبائی وطن کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ "میں تو ہندوستان میں پیدا ہوا لیکن میری طبع پاک خاک خراسان سے تعلق رکھتی ہے"۔ ؎

من نہ ہند آشکار گشتم لیک
طبع پاک من از خراسان است!

لیکن اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ ہندوستان کے کس قطعۂ ارض میں اس نے جنم لیا، قیاس غالب یہی ہے کہ گولکنڈہ ہی اس کا مولد ہوگا بہر حال شاعر کو اپنے آبائی وطن خراسان پر بڑا فخر ہے اور اپنے اشعار میں بار بار وہ اس بات کا اظہار کرتا ہے۔ ؎

بیا دیوان پر شعر مرا سوئے خراساں بر
کہ از گلبانگ شعر خویش شہرت در دکن دادم

شعر نادر معنی ام میرفت در شیراز اگر
ہمچو حافظ شہرۂ ملک خراساں می شدم

وجہی جس زمانہ میں محمد قلی قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھا، اسی زمانہ میں مرزا محمد امین میر جملہ شہرستانی بھی قطب شاہی سلطنت کے عہدۂ میر جملگی (وزارت عظمیٰ) پر فائز تھا اور گولکنڈہ کے سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا، مرزا محمد امین ایک عالم و فاضل اور مدبر وزیر تھا، شعر و سخن سے بھی اسے بہت دلچسپی تھی، فارسی میں شعر کہتا تھا اور روح الامین تخلص کرتا تھا۔ اس کی غزلوں کا دیوان "گلستان ناز" اور خمسۂ نظامی کی طرز و تقلید پر لکھی ہوئی چار مثنویاں دستیاب ہوتی ہیں، حیدر آباد میں اس کا دربار فارسی شاعروں اور ادیبوں کا مرجع و مرکز بن گیا تھا، وجہی نے اپنی فارسی غزلوں میں کئی جگہ بڑے ادب و احترام کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور ایک شعر میں تو اسے اپنا استاد بتایا ہے، کہتا ہے کہ ؎

سخن را بہ سرہ رسانیدہ ام ● کہ روح الامین است استاد من!

کوئی تعجب نہیں کہ وجہی نے اپنے فارسی کلام میں روح الامین سے اصلاح لی ہو، کیونکہ وجہی دکن میں پیدا ہوا تھا اور روح الامین ایک تازہ وارد ایرانی اہل زبان تھا جس کی فارسی دانی مسلم تھی، اور کم عمری ہی میں اس کا شمار ایران کے مانے ہوئے شاعروں میں ہونے لگا تھا۔

وجہی کی ادبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، محمد قلی کے عہد میں، دکنی اردو کے ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے اس نے نام پیدا کیا۔ "قطب مشتری" اس نے اسی زمانہ میں لکھی پھر سلطان محمد کے زمانہ میں وہ گوشہ نشینی اور گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اس دور کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں وہ پھر نمایاں ہوا اور "سب رس" لکھ کر اردو کی ادبی نثر کا سنگ بنیاد رکھی۔ وجہی کے فارسی کلام میں ان تینوں ادوار کی جانب اشارے پائے جاتے ہیں جس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ فارسی شعر گوئی کو اس نے اپنی زندگی کے ہر دور میں جاری رکھا، محمد قلی کے عہد میں اس کی شہرت و مقبولیت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا تھا وہ اس وقت گولکنڈہ کا سب سے بڑا شاعر اور قطب شاہی دربار کا ملک الشعرا تھا۔ یقیناً اس زمانہ میں، جو اس کا عہد شباب بھی تھا، اسے راحت و فراغت کے تمام اسباب میسر ہوں گے، بادشاہ وقت کی طرح وہ بھی ایک رنگین مزاج انسان اور شاہد و شراب کا شاعر تھا جس کی جانب اس نے اپنے فارسی اشعار میں بلیغ اشارے کئے ہیں۔ لیکن جب اس کا سر پرست و قدر دان اٹھ گیا اور سلطان محمد کا دور شروع ہوا تو اس کے عیش و فراغت میں بھی خلل پیدا ہو گیا۔ سلطان محمد کو شعر و سخن سے تو کوئی بیر نہیں تھا لیکن وہ "شراب و شاہد" کا کٹر دشمن تھا پھر بھلا وجہی جیسا رند مشرب شاعر ایک ایسے متقی اور پرہیزگار بادشاہ کے ساتھ کس طرح نباہ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی دربار سے اس کا تعلق باقی نہیں رہا۔ مفلسی اور تنگ دستی نے اُسے آگھیرا اور چشم زدن میں ایک تونگر شاعر ایک قلاش انسان بن گیا جس کی جانب وہ ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے۔ ؎

پادشاہ جہان مفلسیم ● خاک ہم نیست در خزانۂ ما

اور پایان کار سرزمین دکن سے وہ اس قدر دل برداشتہ ہو گیا کہ ترک مقام کے منصوبے باندھنے لگا۔ ایک شعر میں کہتا ہے کہ "اے وجہی تو اپنے فضل و ہنر کے باوصف کیوں اسی مفلسی اور بے زری کی زندگی بسر کر رہا ہے، کیوں نہیں دکن کی سرزمین چھوڑ کر کسی اور ملک کی راہ لیتا"۔

وجہیؔ با چنیں فضل و ہنر بے سیم و زر مسکین!
بہ اقلیم دگر رو، چیز تا کے در دکن باشی!

لیکن پھر اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہے کہ زمانہ کا دستور یہی ہے کہ وہ کبھی ساز گار ہے اور کبھی ناساز گار۔ پھر اگر تو کبھی دولت مند تھا اور آج مفلس ہو گیا ہے تو اس حالت پہ دل کیوں دکھاتا ہے۔ ؎

گر زر و دولت در گدائی آمدی غمگیں مباش
کار دنیا ایں چنیں است گاہ ہست و گاہ نیست!

(باقی)

تبصرے

ریاض الرحمٰن شروانی

رئیس الاحرار: از عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی
ضخامت: ۲۷۲ صفحات، قیمت: پانچ روپے
ملنے کا پتہ: عزیز الرحمٰن تعلیمی سماجی مرکز، بلی ماران، دہلی

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں مسلمان علماء کا کردار بہت تابناک اور قابلِ فخر رہا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسی زمرے کے ایک بہادر اور باحوصلہ بزرگ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی سوانح حیات ہے جسے اُن کے صاحب زادے مولوی عزیز الرحمٰن صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس میں مولانا حبیب الرحمٰن کے سوانح کے علاوہ علمائے لدھیانہ کے جہادِ حریت کی داستان بھی درج ہے۔

علمائے لدھیانہ اور سید احمد خاں مرحوم کی آویزش زیرِ بحث آگئی ہے۔ سید احمد خاں کا موقف و مسلک علمائے وقت کے ایک بڑے طبقے کے طریقۂ کار سے بڑی حد تک مختلف تھا لیکن خدمتِ قوم کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں اور اگر ہم ایک دوسرے کی نیت پر شبہ کرنا چھوڑ دیں تو اختلافِ مسالک کے باوجود ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ مصنف کے قلم نے ان اختلافات کے اظہار میں بعض جگہ حدود سے تجاوز کیا ہے جو مناسب نہیں ہے۔ سید احمد خاں کے خلاف علمائے وقت کے بعض فتوے بھی کتاب میں شامل ہیں۔ ان فتووں سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے اور اُن سے غلط نتائج مرتب کرنے سے بعض اوقات کیسے کیسے برگزیدہ اور صالح نفوس بھی اپنے کو باز نہیں رکھ پاتے ہیں!

مولانا حبیب الرحمٰن ہماری تحریکِ آزادی کے ایک نامور سپاہی تھے اور ان کا تعلق کانگریس، جمعیۃ العلماء، خلافت کمیٹی اور مجلسِ احرار سب ہی سے رہا تھا۔ مجلسِ احرار کے تو وہ مسلسل دس گیارہ سال تک صدر بھی رہے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے جس دور میں اپنی سیاسی زندگی گزاری، اس میں کسی بھی باشعور، دیانت دار اور حق پسند ہندوستانی کی زندگی کے دو ہی مقصد ہو سکتے تھے، ملک کی آزادی اور ملک میں بسنے والے سب فرقوں اور طبقوں کا اتحاد و تعاون۔ مولانا نے بھی اپنی زندگی کے مقاصد میں ان ہی دو مقصدوں کو اولین اہمیت دی۔ اُن کی زندگی کا ایک اور مقصد آزاد ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا باوقار وجود تھا جو دراصل پہلے دو مقاصد ہی کا شاخسانہ تھا۔ اُن کے حق میں یہ بات پوری بلند آہنگی سے کہی جانی چاہیے کہ انھوں نے اپنے لیے جو راہ متعین کر لی تھی اُس پر ہمیشہ ثابت قدمی سے چلتے رہے۔ اس راہ میں اُنھیں دوسرے راہ رووں کی طرح جان و مال کی بیش از بیش قربانیاں دینی پڑیں، وہ "تنہا پسِ زنداں" بھی رہے اور "رسوا سرِ بازار" بھی ہوئے لیکن زندگی کی آخری سانس تک انھوں نے اپنے موقف و مسلک سے سرِمو تجاوز نہیں کیا۔ اُن کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ اپنی فہم و فراست کے مطابق کلمۂ حق کہنے میں بہت جری اور بے باک تھے۔ اس بارے میں انھوں نے نہ کبھی غیر ملکی استبداد کی پروا کی، نہ اپنے ہم مذہبوں کے فرقہ وارانہ جنون کی اور نہ کسی بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر کی۔ جدوجہدِ آزادی کے دوران میں اُن پر بار بار مقدمے چلے اور سزائیں ہوئیں لیکن اُنھوں نے عدالت کے کٹہرے اور جیل کی چار دیواری میں بھی کبھی کلمۂ حق کہنے میں تامل نہیں کیا۔ اسی طرح مسلم لیگی سیاست کے زمانۂ عروج میں اپنے ہم مذہبوں سے برابر یہی کہتے رہے کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو وہ مہلک اور خطرناک ہے اور اس کے نتائج تمھیں ایک دن ضرور بھگتنے پڑیں گے۔ مولانا کے بعض خطوط مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ کے نام کتاب میں شامل ہیں۔ اُن سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے جس بات کو صحیح سمجھا اس کا اظہار ان حضرات سے بھی بلا تامل اور برملا کر دیا۔ اس سے مسلم لیگ کے اس پروپیگنڈے کا بھی بطلان ہو جاتا ہے کہ کانگریسی مسلمان ہندوؤں کے زرخرید غلام تھے اور ہندو لیڈروں کے سامنے ان کی حیثیت محض جی حضوریوں کی تھی۔

"رئیس الاحرار" میں ایسے سیاسی مباحث بھی آتے ہیں جن میں مولانا حبیب الرحمٰن کی رائے سے اتفاق کرنا دشوار ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ کن ہی دو آدمیوں کی رائے بھی ہر مسئلے پر یکساں کیسے ہو سکتی ہے! تاہم ہندوستانی سیاست کے کئی موڑ ایسے ہیں جن پر ان کی اصابتِ فکر اور دور اندیشی کا قائل ہونا پڑتا ہے مثلاً جب ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح دوبارہ ہندوستان کے سیاسی افق پر نمودار ہوئے تو ہمارے اکثر علماء نے ان سے اشتراک و تعاون ضروری سمجھا لیکن مولانا حبیب الرحمٰن اس پر اپنے کو آمادہ نہیں کر سکے۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس بارے میں ان کی رائے کتنی صائب تھی۔ اپنے ایک خطبے میں مولانا نے ہندوستانی کلچر کی بنیاد بجائے مذہبی عقیدے کے جغرافیائی حد بندی قرار دی ہے اس سے ان کا ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ظاہر ہوتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے موقع پر پنجاب میں آگ اور خون کی جو ہولی کھیلی گئی اور فرقہ وارانہ عفریت پر انسانی جان و مال اور آبرو کو جس طرح قربان کیا گیا اُس کی زد میں مولانا کا وطن مالوف لدھیانہ بھی آیا۔ اُن کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما یہ بات تھی کہ اُن کے بعض پرانے سیاسی رفیق بھی اس وقت ایذا رسی تو ان

قائم نہیں رکھ سکے اور فرقہ پرستی کے سیلاب میں بہہ گئے۔ ان حالات میں انھیں بادل ناخواستہ ترک سکونت کرکے پاکستان جانا پڑا لیکن وہ اپنا اصلی مقام ہندوستان ہی سمجھتے تھے اس لئے جلدی ہی واپس آگئے اور دہلی کو اپنا مستقر بنالیا۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان حالات سے گزر کر بھی ان کے اندر تلخی اور انتقام کا جذبہ بالکل نہیں پیدا ہوا، بلکہ وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق بدستور خدمت ملک و ملت میں لگے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے عقیدت مندوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کی بھی بڑی تعداد شامل تھی۔

"رئیس الاحرار" کی ایک خامی یہ ہے کہ اس میں مصنف کا آنا موقع بے موقع اُبھرتا ہے جو بہت برا معلوم ہوتا ہے اور احساس کمتری کی نشان دہی کرتا ہے۔ بعض جگہ طباعت کی غلطیاں بھی ناگوار محسوس ہوتی ہیں۔ بالخصوص بعض تاریخیں اور سن غلط چھپ گئے ہیں۔ مثلاً سنہ ۱۹۴۷ء کے حالات پڑھتے ہوئے اچانک نظر کے سامنے سنہ ۱۹۳۵ء یا سنہ ۱۹۴۹ء آجاتا ہے جو یقیناً طباعت ہی کی غلطی ہے۔ کتاب میں بعض واقعات خود مولانا حبیب الرحمٰن کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ نیز شروع میں ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پیغامات شامل ہیں جن سے صاحب سوانح کے سیاسی مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے اور کتاب کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔

تبصرہ ——————— شہریار

ماہنامہ "تحریک" کا "غالب نمبر"

مرتبین: گوپال متل، مخمور سعیدی، تمکین کاظمی۔

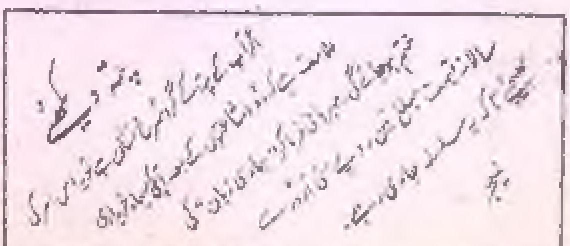
ضخامت: ۱۰۰ صفحات۔ قیمت: ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ: ۹۔ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی ۶۔

اعلیٰ شاعری کی ایک پہچان یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ کسی ایک عہد سے مخصوص ہونے کے باوجود ہر عہد کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور یہ صرف اُس وقت ممکن ہے جب کسی شاعر کا کلام انسان اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا حامل ہو۔ غالب اسکی بہترین مثال ہیں۔

غالب کی شخصیت اور ان کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش حالی سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد متعدد کتابیں اور مضامین لکھے گئے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے بعض کتابیں اور بعض مضامین غالبیات میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن غالب کی ہمہ گیر شخصیت کے بہت سے پہلو اب بھی غور و فکر کے محتاج ہیں۔ ماہنامہ "تحریک" دہلی کے "غالب نمبر" سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے اس نمبر میں جو تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں غالب سے متعلق کچھ نئے پہلو سامنے نہ آئے ہوں۔ تحقیقی حصے میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، گوپال متل؛ اور تنقید کے حصے میں ڈاکٹر وزیر آغا اور عالم خوندمیری کے مضامین تحقیق و تنقید کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔ اس شمارہ کی سب سے اہم چیز "دستنبو" کا اُردو ترجمہ ہے جو نوجوان شاعر اور ادیب مخمور سعیدی نے کیا ہے۔ مترجم نے ترجمہ کو غالب کی منفرد طرز نگارش سے اتنا ہم آہنگ کردیا ہے کہ پڑھ کر یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔

• "مانگے کا اُجالا" کے عنوان کے تحت غالب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں مختلف مضامین سے جو اقتباسات لئے گئے ہیں ان میں سوائے مظفر علی سید کے اقتباس کے اور کوئی اقتباس اہم یا معنی خیز نہیں اس سلسلے میں مزید کاوش کی ضرورت تھی مجموعی طور پر "تحریک" کا "غالب نمبر" غالبیات کے سلسلے میں ایک وقیع اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔



پبلشر نذیر حسن پرنٹر منیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شایع کیا